قرآن کریم کے بیان ہونے کی خصوصیات پر ایک نظر

ڈاکٹر محمد اعجاز نگری*

خلاصہ:

قرآن مجید نے خود کو ''بیان'' اور اس جیسے القاب سے یاد کیا ہے جس کے ظاہری معنی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں ہر چیز واضح وروشن ہے اور اس کے مفاہیم ومعانی وضاحت کے لیے کسی کے محتاج نہیں۔

جبکہ قرآن میں ایسی آیات اور مطالب بھی نظر آتے ہیں جو خود واضح نہیں بلکہ ان کے اصل معنی کے لیے وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقام پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ کیا قرآن کو قرآن ہی کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے یا سنت سمیت دیگر چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں مختلف نظریات سامنے آتے ہیں ان میں سے جنہوں نے کتاب خدا کو ہر چیز کے لیے کافی سمجھا وہ ''اہل قرآن'' کہلاتے ہیں اور جنہوں نے قرآن کے ظواہر کو ناکافی سمجھ کر روایات کو مبین سمجھا وہ ''اخباری'' کہلاتے ہیں۔ لیکن راقم نے اسالیب بیان قرآن کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن اور روایات کے کردار کا جائزہ لیا تو اس نتیجے تک پہنچا کہ قرآن کریم اگرچہ ''مبین'' و ''بیان'' ہے لیکن اس کا معنی یہ ہر گز نہیں کہ اس کی تفصیلات بیان ہو چکی ہوں اور ایسا بھی نہیں کہ اس کے ابہامات قابل حل نہ ہوں۔ لہٰذا قرآن نے اپنے مفاہیم کو مخاطب تک پہنچانے کے لیے مختلف اسالیب جیسے عربی قواعد وضوابط سے آگاہی، شان نزول، آیات محکم ومقید وغیرہ سہل وممتنع، قناعت خاص میں فہم عام کی رعایت اور استعارہ، مجاز وکنایہ کے استعمال وغیرہ کو اختیار کیا ہے۔

کلیدی الفاظ: بیان، سنت، فہم قرآن، ابہام، متشابہات

* ہیڈ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، المصطفیٰ یونیورسٹی اسلام آباد (پاکستان چیپٹر)

مقدمہ

هذا بَيانٌ لِلنّاسِ وَ هُدًى وَ مَوْعِظَةٌ لِلْمُتّقينَ[1]

وَ نَزّلْنا عَلَيک الْكتابَ تِبْيانًا لِكلّ شَيءٍ وَ هُدًى وَ رَحْمَةً وَ بُشْرى لِلْمُسْلِمينَ[2]

صدر اسلام میں مسلمان قرآن کریم کو اس کے حقیقی جلوۂ کے ساتھ حاصل کرتے تھے اور اس کے مقاصد و مطالب کو پاکیزہ ذہنوں کے ساتھ تمام تر فکری و ذہنی آلودگیوں سے دور رہتے ہوئے اچھے طریقے سے ادراک کرتے تھے کیونکہ قران کریم ان کی زبان میں اور ان کے طرز تکلم میں اُتارا گیا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم اپنی جدت وتازگی کی وجہ سے ان کے دل میں اترا اور انہوں نے اس کو خوشی کے ساتھ قبول کیا اور آسانی سے اس کو سمجھتے ہوئے اس کے نورانی سرچشمہ مطالب سے سیراب ہوتے تھے اور کبھی قرآن کریم کی بعض تعبیروں کو نہیں سمجھتے تھے کیونکہ قرآن کریم کے معانی و مطالب اس قدر دقیق ہوتے تھے کہ ان کو سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا مگر یہ کہ ان کی مشکل بہت جلد حل ہو جاتی تھی کیونکہ اعلیٰ وارفع مقام رکھنے والا راہنما اور مشکلوں کو آسان کرنے والا ہادی ان کے پاس تھا جس سے وہ تمام دینی و مذہبی خصوصاً قرآن کریم کی مشکلوں کو حل کروالیتے تھے اور جن مطالب کے فہم وادراک سے ناتواں ہوتے تو وہ راہنمائے عظیم ان کے سامنے بیان کرتے تھے، کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ اگر فریضہ تبلیغ رکھتے تھے تو فریضہ بیان بھی آپ پر تھا۔

وَ أَنْزَلْنا إِلَيک الذِّكرَ لِتُبَينَ لِلنّاسِ ما نُزِّلَ إِلَيهِمْ وَ لَعَلّهُمْ يتَفَكرُونَ[3]

مسلمان زمانہ رسالت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ایک طولانی عرصہ تک اسی طریقہ زندگی پر رہے اور قرآن کریم کی حقیقت کو سمجھا، روشن دلیل اور قاطع حجت کے ساتھ قرآن کریم پر عمل کیا، صلح وصفائی کے معاشرہ میں عزت و عظمت اور کمال سعادت و قدرت سے محکم ترین حبل الٰہی سے وابستہ رہے۔ مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اُن خالص و مخلص مومنوں کے بعد جو مسلمان آئے وہ اس پاکیزہ طریقہ زندگی سے دُور ہوتے ہوئے منحرف ہوگئے اور کئی مختلف راستوں پر چلنے لگے۔ قرآن کریم کے فہم وادراک پر اعتراض کرنے لگے اور قرآن و عترت کے درمیان فاصلے ڈالتے ہوئے تفسیر و احادیث کے اندر اسرائیلی افسانے اور کہانیوں کو داخل کر دیا۔ چنانچہ منافقوں اور بعض زبانی مسلمانوں یا کم اسلامی معلومات رکھنے والے

---

[1] ۔ آل عمران، ۱۳۸

[2] ۔ نحل، ۸۹

[3] ۔ نحل، ۴۴

لوگوں نے معاشرے کے جابر حکمرانوں کی وجہ سے حدیثوں کو گھڑا اور قرآن مجید کے معانی میں تحریف کر کے ان افسانوں اور کہانیوں کو اسلامی معاشرے میں رائج کر دیا۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ آہستہ آہستہ مختلف شکوک و شبہات کو ارکان دین کو کمزور کرنے کے لیے دین میں داخل کر دیا۔

چنانچہ ایسے ہی شبہات سے ایک اہم اور بنیادی شبہ جو کہ موجودہ ابحاث سے بھی ہے قرآن کریم کا قابل فہم ہونا ہے اور ہم نے اس شبہ کا جواب دینے کی کوشش کی ہے زمانی و مکانی وسعت کے مطابق تین ابحاث کو مقالہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔

بحث اول: قرآن کریم کا بیان ہونا:

قرآن کریم کو "مبین" کی صفت سے نوازا گیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم اپنے مقاصد و مطالب کو بیان کرنے میں بہترین بیان کا حامل ہے اور قرآن کریم کے مبین ہونے کو مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے:

۱) قرآن کریم اپنے آپ کو صفت "مبین" سے متعارف کرواتا ہے اور اپنی زبان کو عربی میں شمار کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے:

تِلْک آیات الْکتابِ الْمُبینِ،[۱] وَ هذا لِسانٌ عَرَبِی مُبینٌ.[۲]

۲) قرآن کریم خود کو بیان سمجھتا ہے اور فرماتا ہے:

هذا بَیانٌ لِلنّاسِ وَ هُدًی وَ مَوْعِظَةٌ لِلْمُتّقینَ.[۳]

۳) اپنی آیات کو "مبینات"، "بینات" اور "بینہ" شمار کرتا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

وَ لَقَدْ أَنْزَلْنا إِلَیکمْ آیات مُبَیناتٍ،[۴] وَ لَقَدْ أَنْزَلْنا إِلَیک آیات بَیناتٍ،[۵] فَقَدْ جاءَکمْ بَیِنَةٌ مِنْ رَبِّکمْ وَ هُدًی وَ رَحْمَةٌ....[۶]

۴) قرآن کریم اپنے آپ کو "تبیان کل شیء" سے تعارف کرواتا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

۱۔ شعراء، ۲

۲۔ نحل ۱۰۳

۳۔ آل عمران، ۱۳۸

۴۔ نور، ۳۴

۵۔ بقرہ، ۹۹

۶۔ انعام، ۱۵۷

وَ نَزَّلْنا عَلَیک الْکتابَ تِبْیانًا لِکلّ شَیءٍ وَ هُدًی وَ رَحْمَةً وَ بُشْری لِلْمُسْلِمینَ[1]

۵) قرآن کریم خود کو "نور" کہتا ہے:

فَآمِنُوا بِاللهِ وَ رَسُولِهِ وَ النّورِ الّذی أَنْزَلْنا[2]

۶) قرآن کریم خود کو "بُرھان" کہتا ہے:

یا أَیهَا النّاسُ قَدْ جاءَکمْ بُرْهانٌ مِنْ رَبّکمْ[3]

۷) قرآن کریم خود کو "هُدیٰ" کہتا ہے:

ذلِک الْکتابُ لا رَیبَ فیهِ هُدًی لِلْمُتّقینَ[4]

بہر حال یہ تمام اوصاف قرآن کریم کے بیان، واضح اور آشکار و روشن ہونے کی وضاحت کرتے ہیں۔

لغت میں بیان:

البیان: ما یبیّن به الشئ من الدلالة و غیرها و بان الشئ بیاناً(یعنی) اتضح به فهو بیّن، قالوا بان الشئ و استبان و تبیّن و أبان و بیّن بمعنی واحد.

البیان: الفصاحة و اللّسن و کلام بیّن فصیح و البیان و الافصاح مع الذکاء[5]

بنابرایں صفت "مبین" کو فعل لازم اور فعل متعدی دونوں کے معنیٰ میں لے سکتے ہیں۔ یعنی وہ جو خود روشن اور واضح ہے نیز بیان کرنے اور روشنی دینے والا بھی ہے یعنی "مبین" ہے۔ اس سے بالاتر کلمہ "بیان" وضاحت لفظی کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ جس کو فصاحت اور بہترین گفتگو کہا گیا ہے اس لیے کہ نوع استعمالی کی مناسبت کے لحاظ سے کلام کے معنی میں لیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا جس مقام پر زبان قرآن کریم کو "عربی مبین" کی زبان کہا گیا ہے۔ وَ هذا لِسانٌ عَرَبِی مُبینٌ[6]

اس آیت کو دلیل بیان کیا ہے کہ عربی مبین یعنی قرآن کریم کے بیان کرنے کا لفظی پہلو جو وہی فصاحت اور طریقہ گفتگو ہے۔ چنانچہ اس صفت کو اَعجمی صفت کے مقابلے میں لاتا ہے جو کہ دوسری زبان سے

---

[1] ۔ نحل، ۸۹

[2] ۔ تغابن، ۸

[3] ۔ نساء، ۱۷۴

[4] ۔ بقرہ، ۲

[5] ۔ لسان العرب مادّہ «بان»

[6] ۔ نحل، ۱۰۳

لایا گیا ہے۔ وَ لَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يقُولُونَ إِنَّما يعَلِّمُهُ بَشَرٌ لِسانُ الَّذی يلْحِدُونَ إِلَيهِ أَعْجَمِی وَ هذا لِسانٌ عَرَبِی مُبِينٌ [1]

أعجمی یعنی غیر فصیح زبان جو کہ فصاحت اور گویا تر ہونے سے دور ہو اگرچہ کسی عربی شخص سے ہی جاری ہوا ہو۔ [2]

البتہ جن مقامات پر "مبین" اور "بیان" کی صفت سے قرآن کریم کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں بغیر کسی قرینے کے قرآن کریم اور آیات قرآن کریم کے لفظی پہلو کو بیان کیا گیا ہے تو ان کلمات کے عام معنی قابل غور و توجہ ہیں۔ بنابرایں قرآن کریم "مبین" اور قابل فہم و ادراک ہے، نیز اپنے معانی و مطالب کا بیان اور روشن کرنے والا ہے۔ اسی معنی کو "نور"، "برھان" اور "ھُدیٰ" جیسے کلمات بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ نور خود روشن ہے اور دوسروں کو روشن کرنے والا ہے۔ ان مطالب کی روشنی میں اس مقام پر دو سوال سامنے آتے ہیں۔

۱) ہر زبان کے مخصوص قواعد و ضوابط ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اس زبان کے اہل یا دوسرے لوگ اس زبان کے الفاظ اور عبارات کو پہچانتے ہیں تاکہ بات کرنے والے کی مراد کو یا اُن الفاظ کو لکھنے والے کے مقصود کو بغیر تکلیف و مشقت سمجھ لیں۔ تو کیا قرآن کریم کے الفاظ کو سمجھنے کے لیے بھی کوئی قواعد اور طریقے موجود ہیں؟ بالفاظ دیگر قرآن کریم کی زبان کو پہچاننے کے بھی کوئی اصول و ضوابط ہیں؟ جبکہ اس سوال کا تعلق ہماری بحث سے نہیں ہے اور پھر اس کے جواب میں تفصیلی ابحاث ہیں البتہ ہم آئندہ بحث میں قرآن مجید کے طریقہ بیان کے بارے اجمالی طور پر اشارہ ضرور کریں گے۔

۲) ایک دوسرا اہم سوال ہے جس میں کئی اور سوال بھی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ کیا قرآن کریم کا "بیان"، "مبین" اور "نور" ہونا بعض دوسرے قرآن کریم کے کلمات کے ساتھ مثلاً "متشابہ آیات"، "مجمل"، "مخصص"، "مقید" اور "عام"۔ مطلق وغیرہ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے جبکہ ان الفاظ کو سمجھنے کے لیے اسباب نزول کو سمجھنا ضروری ہے؟

خلاصہ کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ان سوالات کے جواب میں کبھی انحرافی راستوں کو طے کیا گیا ہے جن سے متعلق ہم ذیل میں اشارہ کرتے ہیں۔

---

[1] ۔ نحل، ۱۰۳

[2] ۔ مرحوم طبرسی، مجمع البیان، ج ۶ ص ۵۹۵

فہم قرآن کریم اور مختلف راستے:

اس بحث کے ذیل میں مختصر طور پر بعض نظریات کا تذکرہ ہوگا جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱: نقل افراطی کا راستہ:

اس نظریے کے قائلین نے قرآن کریم کو سمجھنے میں صرف اور صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور صدر اسلام کے مسلمانوں سے جو احادیث و روایات نقل ہوئی ہیں ان کو موثر سمجھا ہے۔

راغب اصفہانی نقل کرتا ہے کہ بعض لوگوں کے عقیدے کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر و بیان کسی کے لیے جائز نہیں ہے، اگرچہ وہ بہت بڑا ادیب اور علوم پر دسترس رکھتا ہو۔ مثلاً فقہ، روایات و احادیث کو جاننے والا ہو بلکہ تفسیر قرآن کریم ان روایات کے ذریعے کی جاسکتی ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (جو نزول قرآن کریم کے گواہ ہیں) یا ان کے تابعین سے نقل ہوئی ہیں۔[1]

البتہ یہ راستہ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں بعض لوگوں کی تفسیر بالرائے کا ارتکاب اور اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی پریشانی سے وجود میں آیا کیونکہ یہ لوگ ضروری علم و آگاہی نہیں رکھتے تھے یا پھر زبان قرآن کریم کے گہرے مطالب سے آگاہ نہیں تھے جس کی وجہ سے اس راستہ کو طے کیا گیا۔ ہاں البتہ بعض دوسرے بزرگ صحابہ کرام اور تابعین عظام نے قرآنی آیات کی تفسیر و تفصیل احادیث و روایات سے بیان کی ہے۔[2]

چنانچہ اس طریقہ تفسیر میں قرآن کریم کے "بیان" و "مبین" ہونے کو احادیث و روایات کے سمجھنے پر موقوف کیا ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن کریم کے مستقل طور پر بیان ہونے کو ایک خاص گروہ کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور اس راستے کو طے کرنے والے لوگوں کو "اخباری" کہا جاتا ہے جنہوں نے احکام نظری سے مربوط آیات کو تفسیر روائی سے مربوط سمجھا ہے اور بعض نے وضاحت کی ہے کہ اگر قرآن کریم کے اطلاقات اور عمومات کی تفسیر میں روایات نہ مل سکیں تو اُن آیات کا کوئی مفہوم و مطلب نہ ہوگا۔

محمد امین استر آبادی نے کہا ہے کہ میری نگاہ میں ہم سے پہلے اخباریوں کا طریقہ درست تھا وہ معتقد تھے کہ قرآن کریم نے عام لوگوں کے ذہنوں کے ابہامات کو دور کرنے کے طرز پر عمل کیا ہے اور پھر سنت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اکثر بیانات اور شریعت کے بیشتر احکام نظری خواہ اصول و کلیات ہوں یا

[1] ۔ راغب اصفہانی، مقدمہ جامع التفاسیر ص ۹۳
[2] ۔ ذہبی، التفسیر والمفسرون، ج ۱ ص ۴۶-۵۱

فروع و جزئیات ہوں جن سے ہم آگاہی نہیں رکھتے، لہٰذا ان کو اگر سمجھنا ہے تو ائمہ ھُدیٰ علیہم السلام کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ چنانچہ اگر احکام نظری کو کتاب و سنت کے ظواہر سے استدلال کرنا ہے تو اہل ذکر سے پوچھنا ہوگا ورنہ ان کی تفسیر کرنا جائز نہ ہوگا۔ بلکہ ان دونوں میں توقف و احتیاط سے کام لینا ہوگا۔[1]

ان جملوں سے یہ سمجھ آتا ہے کہ اخباری لوگ قرآن کریم کی آیات کو سمجھنے میں صرف روایات کے ذریعے قائل ہیں جبکہ اگر قرآن کریم کے عام و مطلق کو بیان کے لیے سنت معصومین علیہم السلام سے کسی مخصص و مقید کو نہ پائیں تو اس کو ناقابل فہم سمجھتے ہیں اور ایسے مقامات پر توقف و احتیاط کا حکم دیا ہے۔

۲: تاویلی انحرافی نظریات:

قرآن مجید کے اصل بیان کو پس پشت ڈالنے کا دوسرا طریقہ بعض تاویلی اور باطنی نظریات ہیں جو تاریخ اسلام میں وجود میں آئے۔ اگرچہ باطن قرآن کریم اور تاویل قرآن مجید ایسی اصل ہے جس کا تعلق قرآن کے گہرے باریک معارف اور اس کے باطنی پیغامات کے ساتھ ہے۔ علماء نے قرآن کریم کے ظاہری اعتبار اور اس کے احکام کی حفاظت کرتے ہوئے اس کے باطنی و تاویلی پہلو کو بیان کیا ہے اور اس کو قرآن کریم سے حصول معرفت کا راستہ قرار دیا ہے۔ اگرچہ کچھ فرقوں نے اس کے باطنی راستے کی نفی ظاہر کے معنی میں لیتے ہوئے احکام شرعی کو کنارے لگانا شمار کیا ہے جو ایک انحرافی راستہ ہے۔

ان انحرافیوں میں اہم ترین فرقہ "خطابیان" کا ہے جو کہ اصحاب ابوالخطاب کہلاتے تھے اور غالیوں کا ایک منحرف فرقہ ہے جو شیعہ سے منسوب ہے اور دوسری صدی ہجری[2] میں پیدا ہوا ہے اور بعد میں فرقہ نصیریہ[3] کہلایا جو کہ محمد بن نصیری نمیری کا پیروکار تھا جو مکمل طور پر تعلیمات الٰہی سے منحرف فرقہ تھا جو دینی و مذہبی راہنماؤں کے بارے میں غلو و افراط سے کام لیتا تھا۔ جبکہ یہ لوگ اپنے نظریات کو مکتب اہل بیت علیہم السلام سے منسوب کرتے تھے حالانکہ حضرات ائمہ ھدیٰ علیہم السلام خصوصاً امام صادق علیہ السلام نے سختی سے ان کو مردود و مطرود قرار دیا ہے۔[4]

---

[1] ۔ الاسترآبادی، الفوائد المدنیہ، ص ۴۷

[2] ۔ عبدالمنعم الحفنی، موسوعہ الفرق والجماعات، ص ۲۲۳

[3] ۔ یہ ایسا منحرف فرقہ جو غالیوں سے ہے اور شیعہ ہونے سے منسوب ہے، تیسری صدی ہجری میں پایا گیا ہے۔

[4] ۔ الخوئی، ابوالقاسم، معجم رجال الحدیث، ج ۱ ص ۲۴۳

بہت سارے ایسے مذاہب ہیں جنہوں نے ظاہر احکام اور معارف قرآن کریم سے منہ موڑا اور اس کو حقیقت پسندی کا نام دیا ہے اور انہوں نے بیان قرآن کریم کو خاص طور پر اہل تاویل کے حق سے مخصوص کیا ہے اگرچہ اُن کا بیان ظواہر قرآنی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

۳: افراطی ظاہر پرستی:

تیسرا طریقہ: جنہوں نے قرآن کی باطنی حقیقتوں اور تعلیمات کی گہرائیوں کا انکار کیا اور بعض آیات کے ظواہر کی تشابہ وجوہات سے بے اعتنائی برتی ہے۔ معارف دینی اور تاویل متشابہات میں عقلائی نظر و فکر سے لاپرواہی کی ہے۔ البتہ اس راستے کو اختیار کرنے والوں نے قرآن مجید کے بیان ہونے کے معنی کو بے حد نچلی سطح پر لیا ہے اور یہ لوگ پہلا طریقہ کے مطابق قرآن کریم و حدیث کے ظواہر کے پہلو کو لیتے ہیں اور اس کی پیروی کرنے والے ہیں۔ ان کے اثرات بعض اسلامی فرقوں کے کلامی نظریات کی صورت میں سامنے آئے ہیں۔ مثلاً: ظاہریہ، اشاعرہ اور سلفیہ وغیرہ [1] جبکہ قرآن کریم کے "بیان" و "مبین" ہونے کا مسئلہ قرآنی و دینی معرفت کے عنوان سے دوسرے دینی علوم و معارف کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیے اور اس سے لاپرواہی کرنا مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں نامناسب ہے۔

زبان دانی کے اصولوں پر غور و فکر کرنے اور مختلف دلائل و شواہد کی بنیاد پر دو بنیادی نکات سامنے آتے ہیں جو کہ قرآن کریم کے "بیان" و "مبین" ہونے کی بنیاد قرار پاتے ہیں اور گذشتہ سوالات کا جواب بن جاتے ہیں۔

پہلا نکتہ: عربی زبان کے قواعد و ضوابط اور فنون جو کہ قرآنی دلالتوں کی بنیاد ہیں اس بناء پر قرآن مجید کے ظواہر جو کہ ادبی قواعد و فنون پر اعتماد کرتے ہیں، کلام الٰہی کے معانی و مدالیل کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہیں مگر اس مقام پر فہم قرآن کریم کی بہترین اور ضروری شرط یہ ہے کہ انسان عربی زبان کو جانتا ہو، قرآن کریم کی عمومی زبان کو سمجھتا ہو۔ جس کی وجہ سے قرآن کریم کے ظاہری معانی و مطالب مفسر قرآن کے لیے ظاہر و آشکار ہو جائیں گے۔ چنانچہ مشکل اور مبہم الفاظ اور تعبیرات جو کہ ممکن ہے کہ آیات قرآن کریم میں دکھائی دیں، عربی زبان کو صحیح طور پر ادراک کرنے سے سمجھ میں آسکتی ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم کی بہت ساری متشابہ آیات میں موجود ابہامات، عربی زبان کے قواعد پر توجہ کرنے سے دور ہو جاتا ہے جو کہ اس کتاب کریم میں متعارف عربی کلام کے مطابق استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً: مجازات، کنایات اور استعارات وغیرہ۔

[1] ۔ اسعدی، دکتر محمد، سایھھا و لایھھای معنایی، ص ۱۳۶

دوسرا نکتہ: یہ ہے کہ قرآن کریم کی خاص زبان اور طریقہ قرآن کریم کے وسیع معانی کی وجہ سے ہے۔ اس لیے قرآن کریم کے ظواہر کے ساتھ ساتھ، فہم قرآن کے ذریعے پوشیدہ پہلوؤں کو سمجھنے کا راستہ کھل جاتا ہے۔[1]

جس طرح کہ قرآن کے عمومی معانی اُن مفسرین اور مخاطبین کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے جو عربی زبان اور قرآن کی زبان کو سمجھتے ہیں ان کے لیے قرآن کے "بیان" و "مبین" ہونے کی نسبت سے اس کے معانی و مطالب کو سمجھنا آسان ہے۔ اسی طرح قرآنی آیات کے گہرے معانی اور دقیق معارف کا سمجھنا بھی اس خاص علم و آگاہی اور باریک بینی سے متعلق ہے۔ چنانچہ قرآن کے کلی اور مجمل معارف و پیغامات کی تفسیر و تفصیل بھی اُسی خاص آگاہی کے مرہون منت ہے۔

اور اس بات کی وضاحت کہ قرآن کے مفاہیم و مطالب میں آیات کے باطنی اور پنہاں پہلو موجود ہیں جو کلام الٰہی کی معرفت سے ہی سمجھ میں آتے ہیں۔ لہٰذا وہ افراد جو قرآن کی زبان سے آشنائی رکھنے والے ہیں ان کے لیے وہ پنہان پہلو "بیان" اور "مبین" ہوتے ہیں۔ کچھ دوسری آیات میں معارف و علوم اجمالی طور پر بیان ہوئے ہیں۔ خواہ وہ آیات نظری علوم کی ہوں یا عملی، جن کی جزئیات اور تفصیلات کو سمجھنا آیات کے پنہاں اور مخفی معانی سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا دین کے تمام رموز و اسرار سے واقفیت اشد ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ مفسر جو ان تفصیلات سے آگاہ ہونا چاہتا ہے اسے سنت سے واقف ہونا ضروری ہے جو دینی مأخذ و مصدر کی ہے تاکہ قرآن کریم کے اطلاق و اجمال کی تفسیر کر سکے، خواہ وہ اصطلاحی اطلاق و عموم پر مشتمل ہو یا کلی مطالب بیان ہوئے ہوں، چنانچہ دین اسلام کے راہنماؤں اور اولیاء الٰہی نے جن کے سر براہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں نے قرآن کریم سے استدلال کیا ہے۔ جس کو وحی الٰہی اور مشاہدات عالی معنوی سے حاصل کیا ہے نہ کہ ان کی معرفت و حقیقت کا تعلق متعارف آیات اور ظاہری فہم و ادراک کے ساتھ تھا۔ بنابرایں نتیجہ لیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کا بیان ہونا علوم قرآن مجید کی مختلف سطحوں اور گوناگوں مخاطبین ہونے کی وجہ سے کئی مرتبے اور درجات رکھتا ہے۔ جس طرح قرآن مجید عام لوگوں کے لیے "بیان" و "مبین" ہے۔

هذا بَيانٌ لِلنّاسِ[2] اسی طرح جو لوگ دینی حقیقتوں کے بارے میں روشن ضمیر و فکر ہیں، ان کے لیے بے حد جامع اور وسیع "بیان" و "مبین" ہے۔

---

[1] ۔ ہمان ص ۱۳۷

[2] ۔ آل عمران، ۱۳۷

قَدْ بَيَنّا لَكمُ اْلآياتِ ان كنْتُمْ تَعْقِلُونَ [1]

اور وہ ہستیاں جو "راسخون فی العلم "ہیں جو مکمل طور پر علم دین کے حامل ہیں، قرآن کریم کے باطن اور تاویلات سے آگاہ ہیں، ان کے لیے قرآن کے تمام تر پہلو "بیان "اور "واضح "ہیں۔

...وَ ما يعْلَمُ تَأْويلَهُ إِلاّ اللهُ وَ الرّاسِخُونَ فِى الْعِلْمِ [2]

اور حقیقت میں قرآن کریم کا بیان ہونا قرآن مجید کے مقاصد و معانی کے مبہم و پنہاں ہونے کے مقابلے میں ہے نہ کہ ان کے علوم و معارف کے مجمل اور گہرا ہونے کے مقابلے میں۔ بالفاظ دیگر قرآن مجید کے بیان ہونے کو ان کے مختلف معانی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ اُن میں سے "بیان "کا پہلا معنٰی ابہام و پنہاں ہونے کے مقابلے میں ہے۔ جس طرح کہ "مبین "و "مجمل "کے معنی کی شرح کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "مجمل" وہ ہے جسکی دلالت روشن نہ ہو۔ [3] جس کی دلالت کئی معانی میں مردّد ہو اور اُن کئی معانی میں سے کسی ایک معنی کو معین کرنے کی کوئی دلیل نہ ہو [4] بہر صورت، "بیان"، "مجمل" کے برابر ہوتا ہے مبین وہ ہے جس کی دلالت واضح اور روشن ہو اور محتمل معانی کو معین کرنے کے لیے قرینہ بھی ساتھ ہو۔ قرآن کریم اس بنا پر "بیان " ہے نہ اس معنی میں کہ قرآن مجید میں ایسی نشانیاں موجود ہوں جن کی وجہ سے اپنے اجمال کو بر طرف کردے۔ البتہ بعض کلمات جن کے بارے میں اجمال و اشتراک کا دعویٰ کیا گیا ہے، ان کے لیے لغت کا جاننا ضروری ہے اور تفسیر سے پہلے لغت کی معرفت اشد ضروری ہے۔

اب اگر کوئی کلمہ متعدد معانی پر اشتراک لفظی سے اطلاق کرے تو قرآن مجید کے "بیان "ہونے کی وجہ سے معانی کے تعین و ترجیح کیلیے قرآن میں سے شواہد تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ "العین" جو کہ مشترک لفظی ہے۔ اس کے معانی کی تعیین کے لیے اور مخصوص معنی کو معین کرنے کے لیے قرائن قرآنی موجود ہیں۔

جیسے: فيها عَينٌ جارِيةٌ فيها سُرُرٌ مَرْفُوعَةٌ [5] جنت میں چشمے جاری ہیں جن میں بلند تختے موجود ہیں۔

---

[1]۔ آل عمران، ۱۱۸

[2]۔ آل عمران، ۷

[3]۔ السیوطی، جلال الدین، الاتقان، ج ۲ ص ۱۸

[4]۔ صبحی صالح، مباحث فی علوم القرآن، ص ۳۰۸

[5]۔ غاشیہ، ۱۳، ۱۲

ابْيضّتْ عَيناهُ مِنَ الْحُزْنِ [1] ان کی آنکھیں غم واندوہ کی وجہ سے سفید ہو گئیں۔

پہلی آیت کے سیاق سے چشمہ مراد ہے دوسری آیت کے سیاق سے آنکھ مراد ہے۔

اگر کوئی کلمہ اشتراک لفظی کے ثابت ہونے پر متعدد معانی میں سے کسی ایک معنی کی تعیین و ترجیح پر قرآن مجید میں کوئی قرینہ و دلیل نہ ہو اور تمام معانی مراد ہو سکتے ہوں اور قرآن کریم کے دوسرے علوم و معارف اس کے بعض معانی کو ردّ نہ کریں تو پھر قرآن مجید کے اصل "بیان" کی بناپر تمام معانی اور احتمالی وجوہات کو آیت کے صحیح مدلولات و مقاصد شمار کیا جائے گا۔ لہٰذا قرآن کریم میں کسی کلمہ کا پایا جانا جس کے راجح اور معین معنی نہ ہوں تو وہ قرآن مجید کے بیان میں ابہام پانے کا واضح مصداق ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے قرآنی عبارتوں کو مجمل شمار کیا ہے اور اس کی وضاحت میں توقف کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایک لفظ کا متعدد معانی میں استعمال ہونے کو بے حد مشکل شمار کیا اور کوئی راہ حل تلاش نہ کر سکے، جبکہ اس طرح کا استعمال اہل ادب کی عبارات میں مشہور ہے اگرچہ عام عرفی بیانات میں اس کا رواج نہیں ہے اور قرآن کا کئی وجوہات پر مشتمل ہونا کم از کم بیان قرآنی میں دلیل ہے۔ [2]

بعض محققین نے مجمل و محتمل کے درمیان تفکیک کی ہے اور مجمل کو مبہم لفظ شمار کیا ہے، جس سے معنی مراد سمجھ میں نہیں آتا اور محتمل کو ایسا لفظ جانا ہے جو اصل وضع کے اعتبار سے کئی معانی پر دلالت کرتا ہے اور سارے معانی قابل فہم اور ابہام سے خالی ہوتے ہیں اب وہ اس کے معانی حقیقی ہوں یا مجازی۔ البتہ ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ لفظ محتمل کی دلالت معنی پر واضح و روشن ہوتی ہے اور لفظ مشترک کو ان سب پر محمول کیا جاسکتا ہے، مگر مبہم لفظ کی کسی معنی پر روشن دلالت نہیں ہوتی، اس کے علاوہ ہمیں یہ یقین ہے کہ شارع نے لفظ مجمل کو کسی کے حوالے نہیں کیا مگر لفظ محتمل کے معانی کی تبیین کو علماء کے سپرد کیا ہے، اس واضح بیان کے بعد محتمل الفاظ اور تعبیرات کو مبین تعبیرات شمار کیا جاسکتا ہے۔ [3]

قرآن کریم کے بیان ہونے کو صرف نفی ابہام کے معنی میں لیا جائے گا، نہ کہ نفی احتمال کے معنی میں اسی بناپر زرکشی نے البرھان میں کہا ہے کہ لفظ مشترک کا تمام معانی پر محمول کرنا صحیح ہے جب خاص معانی کی تعیین پر قرینہ نہ ہو۔ [4]

---

[1] ۔ یوسف، ۸۴

[2] ۔ اسعدی، محمد، سایھا ولایھای معنایی، ص ۱۴۰

[3] ۔ السیوطی، جلال الدین، الاتقان، ج ۲ ص ۲۰ نوع ۴۶

[4] ۔ زرکشی، البرھان فی علوم القرآن

دوسرا معنی: قرآن کے بیان ہونے کا معنی نظری و غیر واضح ہونے کے مقابلے میں بدیہی اور واضح ہونا ہے، اس معنی کو قرآن کریم کے بارے میں درست شمار نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ قرآن کریم کا سمجھنا حدود و قیود رکھتا ہے جن کی علوم قرآن کے علماء نے بے حد تاکید کی ہے حتیٰ کہ آیات کے ظاہری اور مشہور مطالب بھی عربی زبان کے ادبیات و قواعد کو سمجھنے پر موقوف ہیں، اس کے بعد معارف وعلوم قرآنی کے تمام گہرے پہلو، ظاہری اور تنزیلی پہلوؤں کے ساتھ قرار پاتے ہیں جو دینی دلیلوں کی نگاہ میں معارف قرآنی میں سے ہوتی ہیں۔

تیسرا معنی: یہ ہے کہ قرآن کے بیان ہونے کا مقصد مفصل ہونا ہے اور تمام تر جزئیات و تفصیلات پر مشتمل ہونا ہے جو کہ ہر قسم کے اجمال و کلی ہونے کے مقابلے میں ہے۔ یہ معنیٰ بھی قرآن کریم کے بارے میں قابل قبول نہیں ہے کیونکہ ایسے بیانات جو تمام مطلق ہیں اور تفصیلات و خصوصیات اور قیود و حدود کی شرح کرتے ہیں وہ قرآن کریم میں موجود ہیں اور سنت کی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے کہ قرآن کریم کی تمام تفصیلات، خصوصیات اور قیود کو بیان کرتا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے:

أَنْزَلْنا إِلَیک الذِّکرَ لِتُبَیِّنَ لِلنّاسِ ما نُزِّلَ إِلَیهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یتَفَکرُونَ [1]

ہم نے کتاب ذکر کو تمہاری طرف ارسال کیا ہے تاکہ جو کچھ ان پر نازل کیا ہے ان کے سامنے بیان کرو شاید وہ غور و فکر کریں۔

...وَ ما آتاکمُ الرّسُولُ فَخُذُوهُ وَ ما نَهاکمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا [2]

جو کچھ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دے دے وہ لے لو اور جس سے روک دے اس سے رُک جاؤ۔

ان دو آیات سے دو قسم کا نتیجہ لیا گیا ہے۔ ایک نتیجہ وہ ہے جس کا تعلق نقل کرنے والوں کے ساتھ وابستہ ہے جنہوں نے بیان قرآن کریم کے لیے سنت سے استفادہ کیا ہے۔ مگر باریک اثر یہ ہے کہ ہم ظواہر قرآن کریم اور قرآن مجید کے بیان ہونے کی حجیت کے دلائل و شواہد کے تناظر میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیات، قرآن کریم کے تفصیلی معارف اور احکام کو بیان کرنے میں سنت کا کردار بیان کر رہی ہیں نہ کہ ظواہر و معارف کو بیان کرنا یا پھر آیات کے نزولی اوقات کو جن کے القاء کا مقصد بیان قرآن کریم تھا۔

بنابرایں قرآن کریم "بیان" و "مبین" ہے، البتہ اس معنی میں نہیں ہے کہ تمام تر تفصیل فروعات، جزئیات اور مطالب پر مشتمل ہو جس کو بدیہات کا درجہ دیا جائے اور بالکل پیچیدگی اور باریک بینی سے خالی

[1] ۔ نحل، ۴۴
[2] ۔ حشر، ۷

ہو۔ بلکہ اس معنی میں ہے اس کی پیچیدگی اور ابہامات قابل حل ہیں اور اپنے مقاصد کو بیان کرنے والا ہے جس کے لغاتی ابہامات کو عربی زبان کے قواعد و ضوابط سے حل کیا جاسکتا ہے اور تفسیری و معنوی پیچیدگیوں کو قرآنی قرائن و شواہد سے اور قرآن کی زبان کو سمجھنے سے حل ہو سکتے ہیں۔

یوں بھی کہہ سکتے ہیں: قرآن "بیان" و "مبین" ہے اور مقاصد و مطالب کو بیان کرنے میں خود کفیل اور مستقل ہے۔ البتہ اجمال قرآن کریم جو کہ تفصیلات و جزئیات کے مقابلے میں ہے جو صرف قرآنی شواہد کی بناپر حل ہونے والا نہیں ہے بلکہ تمام تر دین پر کلی نگاہ اور دینی منابع سے قابل حل ہیں۔ جس کو صرف علوم دینی سے آگاہی رکھنے والے اور تفسیر قرآن کریم کو جاننے والے علماء ہی حل کر سکتے ہیں۔

جن محققین نے قرآن کریم کے بیان ہونے کو قرآن کریم کا مستقل مقام جانا ہے اور قرآن کریم کو اپنے مقاصد و مطالب بیان کرنے میں کسی کا محتاج نہیں سمجھا حتی کہ سنت و روایات کا محتاج بھی نہیں سمجھا[1] وہ "اہل قرآن" کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ قرآن کریم کے بیان ہونے کے نظریے کی تبلیغ و ترویج کرتے ہیں۔ وہ لوگ قرآن کریم کے وہ نظری و عملی علوم جن کی شرح قرآن میں نہیں کی گئی ہے کو قرآنی مقاصد و مطالب میں سے ہی نہیں سمجھتے اور اس بارے میں سنت و روایات کی احتیاج سے انکار بھی نہیں کرتے۔

ان کے مقابلے میں وہ محققین جنہوں نے بیان قرآن کریم میں احتیاج اور خود مستقل نہ ہونا اور اپنے مقاصد کے بیان میں خود کفیل نہ ہونے میں گفتگو کی ہے انہوں نے دوسرے نظریہ کو اپنایا ہے۔[2]

چنانچہ اس مفصل بیان کے بعد ان دو گروہوں کے تفصیلی جھگڑے سے بہت اچھا نتیجہ لیا جاسکتا ہے۔ در حقیقت دوسرے گروہ (مذکورہ محققین کا جنہوں نے گروہ اول کے تفسیری رویہ پر اعتراض کیا ہے) کا مقابلہ ایسے مفسرین کے ساتھ ہے جنہوں نے تفصیلات شریعت اور احکام فقہی کے استدلال کرنے میں ظواہر قرآنی پر اعتماد کیا ہے اور تمام بیانات قرآن کریم کو استدلال فقہی کے قابل سمجھا ہے حتی کہ آیت کے سکوت کو بھی بعض فروعات کے بارے میں حکم شرعی کہا ہے۔

آخری گروہ جو زیادہ تر عامہ سے ہے۔ احکام شرعیہ میں اہل بیت علیہم السلام کی روایات سے محروم ہیں اور حتی الامکان احکام شرعی میں رائے، قیاس اور استحسان کو اہمیت دیتے ہیں اور ناگزیر ہو کر اپنے قرآنی استدلالات کو احکام شرعی میں بہت وسعت دی ہے۔ البتہ پہلا طریقہ علامہ طباطبائی کی لکھی ہوئی کتاب تفسیر المیزان کی وجہ سے کھل گیا ہے انہوں نے تفصیلات اور جزئیات کے بارے میں قرآن کریم کے کلی اور

---

[1] ۔ قرآن در اسلام، طباطبایی، محمد حسین، ص ۱۸-۲۰

[2] ۔ اسعدی، محمد، لایه ها و سایه های معنایی، ص ۱۴۲

مجمل ہونے میں اور مقام ظاہری قرآن کریم میں تفکیک کو اپنایا ہے اور قرآنی معارف جن کی تفصیلات بیان نہیں ہوئی ہیں، مخصوصاً احکام شرعی میں تفصیلات بیان کرنے کو علم تفسیر کی حدود اور مفسر قرآن کی شان سے باہر سمجھا ہے۔ اسی وجہ سے تفسیر المیزان تمام فقہی ابحاث کی تفصیل سے خالی ہے اور صاحب المیزان نے بعض مقامات پر بیان کیا ہے کہ ان مفاہیم و مطالب کی تفصیلات کو علم فقہ اور فقہی کتابوں میں تلاش کیا جائے۔

البتہ اس بات کو قرآن کے "بیان" و "مبین" ہونے کے خلاف یا تفسیر کی کمزوری نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ مؤلف کی نگاہ میں تفسیری حدود و حرمت کی رعایت کی وجہ سے ہے۔ پس نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کریم اپنے مقاصد و مطالب کو بیان کرنے میں "بیان" و "مبین" ہے اور ایک محقق قرآنی، تفسیر قرآن کریم میں قرآن مجید کی زبان سمجھنے کے ساتھ کسی اور چیز کا سہارا لیے بغیر قرآن کریم کے مقاصد و مطالب کو ادراک کر سکتا ہے اور قرآنی بیانات میں اصلاً کوئی غیر قابل حل پیچیدگی اور ابہام ہی نہیں۔ البتہ ممکن ہے کہ زبان قرآن مجید کو سمجھنے میں مشکلات اور رکاوٹوں کی وجہ سے قرآن کریم کے ان مطالب اور مقاصد سے بھرہ مند نہ ہو سکیں جن سے قرآن کی روشنی میں آگاہ ہونا ممکن ہے۔ قرآن کریم کا اپنے مقاصد و مطالب کو بیان کرنے میں مستقل اور خود کفیل ہونے کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن مجید نے کسی بھی دوسرے مأخذ و مصدر کا محتاج ہوئے بغیر اپنے لیے "بیان" و "مبین" ہونے کی صفت بیان کی ہے اور منکرین کو اسی قرآن مجید کی طرف دعوت دی گئی ہے اور کشف حقیقت کے لیے قرآن مجید میں تدبر و تفکر کرنے کو کافی سمجھا ہے۔

أَ فَلا يَتَدَبَّرُونَ الْقرآن وَ لَوْ كانَ مِنْ عِنْدِ غَيرِ اللهِ لَوَجَدُوا فيهِ اخْتِلافًا كثيرًا [1]

لہٰذا قرآن مجید میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے۔ اگر غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں فراواں اختلاف کو دیکھتے۔

بحث دوم:

قرآن مجید کا بیان ہونا اور آیات کے مختلف اثرات

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آیات قرآن مجید کے مختلف اثرات ہیں، کبھی تو آیت کی تفسیر یا اس کو سمجھانے کے لیے اس آیت کے شان نزول سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کبھی تو آیت "مجمل" کبھی "عام" و "متشابہ"

[1] ۔ نساء، ۸۲

ہے۔[1] لہذا ہم ذیل میں کچھ قرآنی "مجمل"، "مطلق" اور "متشابہ" آیات اور قرآن مجید کے "بیان" ہونے کے ساتھ مناسب رکھنے والے کچھ موارد کا تذکرہ کریں گے۔

۱) قرآن کریم کا بیان ہونا اور شان نزول کی روایات:

اگر قرآن کریم کے بیان ہونے کو زمانہ نزول کے لوگوں کے ساتھ خاص سمجھا جائے تو واقعات نزول، قرآن کریم کے بیان ہونے اور اسباب نزول کی روایات میں کوئی تصادم نہیں ہے لیکن اگر قرآن مجید کا "بیان" ہونا ایک کلی حقیقت کے معنی میں لیا جائے، یعنی قرآن مجید کی کلیت اور دائمی (زمانہ نزول سے لیکر قیامت تک کے لیے) کو سامنے رکھا جائے، تو پھر سوال سامنے آئے گا۔

اگر کہا جائے کہ قرآن مجید کا بیان ہونا خارجی دلیلیوں کی بناپر ہے اور انہی کے تناظر میں اپنے مقاصد کو بیان کرنے والا ہے تو پھر کوئی سوال سامنے نہ آئے گا کیونکہ مختلف دلیلیوں کی بناء پر ہر متن "بیان" شمار ہوگا۔

تو پھر جواب میں کہا جائے گا کہ قرآن مجید کی خصوصیت یہ ہے کہ قرآن مجید دینی و مذہبی دلیلیوں میں مرجعیت و محوریت رکھتا ہے اور روایات کو پرکھنے کا سب سے بڑا ملاک و معیار ہے تو پھر اگر واقعات نزول کو ضعیف احادیث و روایات کے ذریعے سے سمجھا جائے اور انہی کو فہم قرآن کریم کی بنیادی شرط قرار دیا جائے تو قرآن مجید کا صحیح سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔ جس کے نتیجے میں قرآن مجید کا بیان ہونا قابل خدشہ ہو جائے گا۔ حتی اگر قرآن کریم کا صحیح سمجھنا واقعات نزول قرآن کی معتبر روایات کے ذریعے ہو بغیر اس کے کہ آیات قرآن کریم ان کے صحیح ہونے کی گواہی دے تو قرآن کے بیان ہونے سے منافات پیدا کرلے گا۔

(وضاحت بیان گذشتہ) نظری اور علمی بحث ہونے کے لحاظ سے قرآن کریم کے بیان ہونے کو حالیہ قرائن اور اسباب نزول قرآن کے ساتھ وابستہ سمجھا جاسکتا ہے۔ مگر یہ کہ احادیث و روایات کے امتحان کا معیار قرآن مجید پر پیش کرنا ہے اور قرآن کریم کے ساتھ ہم آہنگ اور مناسب ہونا ہے اور پھر فرض بحث بھی یہی ہے کہ احادیث و روایات سے حاصل ہونے والے مذکورہ قرائن قرآن مجید کے بیان ہونے سے منافات رکھتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ قرآن مجید کے "بیان" ہونے پر منطبق ہونے والا جواب دیا جائے اور یہ جواب دو طریقوں سے دیا جاسکتا ہے۔

۱) قرآن مجید کا سمجھنا اسباب نزول کے سمجھنے کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ آیات کے قرائن حالیہ کی بناپر ہے۔

---

[1]۔ اس بحث میں اہل علم حضرات نے بہت زیادہ ابحاث ذکر کی ہیں ہر اہل علم نے اپنے نظریہ کے دفاع میں آیات اور روایات سے دلیلیں لائی ہیں جن کو علوم قرآن کی کتابوں میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

۲) قرآن کریم کا سمجھنا اُن احادیث و روایات کے سمجھنے پر موقوف ہے جو قرائن کو حکایت کرتے ہیں۔

پہلی بحث کے بارے:

نزول قرآن مجید تدریجی ہے جس کو بہت ساری آیات بیان کر رہی ہیں اور قرآن مجید کے سمجھنے کو مذکورہ قرائن کے ساتھ فطرتی وابستگی سمجھتے ہیں۔ البتہ اس نکتہ کو قبول کرنا نکتہ دوئم سے وابستہ ہونے کا لازمہ نہیں ہے یعنی قرآن مجید کے بیان ہونے کی اصل پر اعتماد کر کے زبان قرآن مجید اور قرآن کی عبارتوں کے سیاق کو ایسی دلیلیوں اور قرائن کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں جو نزول قرآن کی حکایت کرتے ہیں اور روایات منقولہ کی احتیاج بھی نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ طباطبائی (رح) تفسیر میں فہم قرآن کے اسباب نزول کی روایات صحیح نہیں سمجھتے۔ اسی بناء پر متن قرآن مجید میں موجود قرائن کو آیات کے سمجھنے میں کافی جانتے ہیں۔ وہ روایات منقولہ کو پرکھنے کے بعد آیات کے ظواہر اور سیاق پر پیش کرتے ہیں اور کبھی ایسی روایات کو مردود شمار کرتے ہیں جو سند کے لحاظ سے صحیح تو ہوتی ہیں لیکن متن آیات میں موجود قرائن کے ساتھ ربط نہیں رکھتیں۔[1]

دوسرے محققین نے بھی اس نکتہ پر توجہ دی ہے کہ علماء نے بھی تاریخی روایات کو خود قرآن مجید پر مقدم نہیں کیا۔[2] جیسا کہ قرآن مجید کا روایات کی قبول و رد کا مقیاس اور ترازو بننا اس امر کی دلیل ہے۔

خلاصہ کلام:

اسباب نزول قرآن مجید کی وہ احادیث و روایات جو درست اور تفصیلی طور پر قرآن مجید کو سمجھنے کی راہنمائی کرتی ہیں، ایسا نہیں ہے کہ وہ مقاصد قرآن کریم کو بیان کرنے کا مستقل طور پر مأخذ و مصدر قرار پائیں اور ان کے سمجھے بغیر قرآنی آیات کے معانی مبہم و بے مقصد ہو جائیں بلکہ قرآن کریم "بیان" و "مبین" ہے جس کے اندر موجود دلالتوں کی وجہ سے وہ اپنے مقاصد کے پہنچانے میں کسی دوسری مأخذ و مصدر کا محتاج نہیں ہے۔ نزول آیات کے حالیہ قرائن تنزیلی مفاد کو روشن کر دیتے ہیں اور ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ مقاصد قرآنی شواہد سے مستقل طور پر صرف روایات سے ہی ہاتھوں میں آئیں۔

۲) قرآن کریم کے مبین ہونے کا نسخ، تخصیص اور تقیید سے رابطہ:

چنانچہ قرآن کریم کے بیان ہونے کے ساتھ وجود نسخ، تخصیص اور تقیید کا چیلنج اور ان کا وصف "بیان"، "مبین" ہونے کو سمجھنے میں کچھ مقدمات کی ضرورت ہے۔ لہٰذا پہلے مقدمات کو بیان کیا جاتا ہے۔

---

[1] ۔ طباطبایی، محمد حسین، المیزان، ج ۴ ص ۷۴ و ۷۸، قران در اسلام ص ۱۰۴-۱۰۶

[2] ۔ صبحی صالح، مباحث فی علوم القرآن، ص ۱۴۸

متقدمین کے نزدیک نسخ ایسا مفہوم ہے جس میں تخصیص، تقیید اور تبیین کو بھی شامل ہے۔ بالفاظ دیگر ہر وہ تبدیلی جو کسی حکم کے مفاد کو عارض ہوتی ہے اس مسئلہ کے ذیل میں آتی ہے۔[1] حدیثی نسخ کا استعمال بھی اسی اصطلاح کے مطابق ہوتا ہے اور متاخرین کے نزدیک تخصیص یا تقیید کی طرف پلٹنے والے بہت سارے موادر انہیں روایات کے ماتحت نسخ کے عنوان کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔[2]

مگر متأخرین کے نزدیک "نسخ" کا مخصوص مفہوم ہے، جس کا مطلب کسی حکم شرعی کو کسی دوسری دلیل کے ساتھ اُٹھالینا ہے۔[3] اس اصطلاح کے مطابق "تخصیص" یعنی "عام" کے بعض افراد کو مقصور و محدود کر دینا ہے اور "عام" ایسا لفظ ہوتا ہے[4] جو اپنے تمام افراد کو بغیر کسی قید کے شامل ہو۔[5] اب اگر شمول و عمومیت، وضع لغوی اور صیغہ مشخص کے ساتھ ہو تو "عام" کہلاتا ہے اگر مقدمات حکمت اور کلام کے قرائن خارجیہ کے ذریعے سمجھا جائے، تو "مطلق" شمار کیا جاتا ہے اور دائرہ مطلق کے شمول کو محدود کرنے کو "تقیید" کہتے ہیں۔

پس متأخرین کے نزدیک "نسخ"، "تخصیص" اور "تقیید" میں فرق یہ ہے کہ نسخ، یعنی کسی حکم سابق کی مشروعیت اور اس کے اعتبار میں تصرف کرنا اور اس کے اعتبار کے ختم ہونے کا اعلان کسی خاص زمانے میں کرنا ہے۔ مگر "تخصیص" و "تقیید" کا مطلب، بیان حکم کی کیفیت میں تصرف کرنا اور عام و مطلق کے مورد نظر افراد کو واضح کرنا ہیں۔[6]

بالفاظ دیگر "نسخ" میں سابق حکم کا باطل ہونا ہوتا ہے مگر "تخصیص" و "تقیید" میں حقیقت حکم بیان کیا جاتا ہے لہٰذا اگر "تخصیص" و "تقیید"، "مطلق" و "عام" کے ثابت ہونے کے بعد اس طرح وجود میں آئے کہ "مطلق" و "عام"، "تقیید" و "تخصیص" کے وارد ہونے سے پہلے قابل عمل تھے، تو ان دونوں کو بھی "نسخ" کے حساب میں شمار کیا جاتا ہے۔ مذکورہ مسائل کبھی تو قرآن کریم اور آیات قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی ایک آیت دوسری آیت کو نسخ کرتی ہے، یا تخصیص و تقیید کرتی ہے اور کبھی قرآن و غیر قرآن

---

[1] ۔ الشاطبی، الموافقات، ج ۳ ص ۱۰۸

[2] ۔ ہمان، صص ۱۰۸-۱۱۷

[3] ۔ ہمان، ص ۹۹-۱۰۰

[4] ۔ زرقانی، مناہل العرفان، ج ۲ ص ۸۰

[5] ۔ سیوطی، الاتقان، ج ۲ ص ۴۵

[6] ۔ ہمان

(دوسری دینی ادلہ) کے ساتھ ربط وارتباط میں پائے جاتے ہیں۔اس مطلب میں کہ قرآن کریم کا بیان غیر قرآن مجید یعنی روایات کے ذریعے سے منسوخ مخصّص یامقیّد ہوتاہے۔

پہلی صورت میں قرآن کریم کے "بیان" و "مبین"ہونے کے ساتھ کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ "نسخ"، "مخصص" و "مقید"قرآن کریم کا حصہ ہیں جواللہ تعالیٰ کے کلام واحد کے عنوان سے ایک دوسرے کے ساتھ قرائن وشواہد شمار ہوتے ہیں۔چنانچہ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

... كتاب الله ... ينطق بعضه ببعض و يشهد بعضه على بعض...

کتاب خداکا بعض،دوسرے بعض کو بیان کرتاہے اور بعض،دوسرے بعض پر شہادت دیتاہے۔

مگر دوسری صورت جس میں قرآن کریم کو غیر قرآن مجید (روایات) کے ذریعے تخصیص وتقیید کرنا ہوتاہے تواس صورت میں کہاجاسکتاہے کہ "نسخ" یعنی قرآن کریم کے بیان کو غیر قرآن کے ذریعے نسخ کرنا، وقت کے گزرنے کے ساتھ قرآن کے بیان کو غیر قرآن کے ذریعے باطل قرار دینے کے معنی میں ہے اور نسخ کی یہ تعبیر قرآن کریم کے سالم و محفوظ ہونے کے خلاف ہے۔لٰہذا اگر متأخرین کی اصطلاح کے مطابق "تخصیص" و "تقیید"اس معنیٰ میں ہو کہ قرآن کریم کے حکم عام سے افراد کو نکالا جائے یاقرآن مجید کے مطلق حالات سے بعض کو خارج کیا جائے جبکہ ان کا ثبوت صریحاًاور حقیقتاًقرآن مجید میں موجود ہو تو پہلی دلیل کی بناپر بیان قرآن کریم کو باطل شمار کرنا ہوگا۔پس اس بناپر غیر قرآن مجید (روایات) کے ذریعے سے بیان قرآن مجید کے مفاد میں تصرّف کرنابیان قرآن کریم کا نقض وابطال شمار نہیں ہوناچاہیے اور پھر دوسری طرف آیات قرآن کریم کا بیان سُنّت کے ساتھ "نسخ"، "تخصیص" اور "تقیید" اجمالی طور پر فراوان شواہد کے ساتھ مسلم ہے لٰہذااس وجہ سے شان قرآن کریم کے مطابق صحیح تحلیل و تبیین کی جانی چاہیے۔پس معلوم ہوتاہے کہ غیر قرآن کے ذریعے نسخ قرآن کریم اس معنی میں قابل قبول ہے کہ غیر قرآن مجید اُن قرائن وشواہد کے ذریعے سے نسخ قرآن کریم کی تبیین کرے جو خود قرآن مجید میں ذکر ہوئے ہیں۔ بالفاظ دیگر: اگر کوئی حدیث کسی آیت کے نسخ کو دوسری آیت کے ذریعے بیان کرے تو حدیث صرف اسی بات کی راہنمااور اشارہ کرنے والی ہو۔

اسی طرح "تخصیص"و"تقیید" قرآن کریم کے اجمالی بیان کو تفصیلات کے ساتھ بیان کرنے کی صورت میں ہو تو جائز اور سنت کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔کیونکہ قرآن مجید کے عمومات اوراطلاقات، نصوص صریح صورت میں نہیں بلکہ صرف ظہور ابتدائی اور مراد استعمالی کی صورت میں تھے۔جبکہ متکلم کی مراد حقیقی تک پہنچنااس صورت میں ممکن ہے جب قرآن کریم کے عموم واطلاق پر کامل طور پر قرائن وشواہد

ثابت شدہ ہوں۔ لہٰذا اس صورت میں تخصیص و تقیید کے نام پر روایات کے ذریعے قرآن مجید کے احکام کو ختم کرنا درست نہیں ہے۔ جیسا کہ آیہ شریفہ:

...وَ أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيعَ وَ حَرَّمَ الرِّبا...[1] میں کلمہ "البیع" حکم شرعی حلیّت کی عمومیت کو بتاتا ہے جو تمام اقسام معاملات کو شامل ہے اور حدیث و سُنت میں بعض فاسد و باطل معاملات کو بیان کیا گیا ہے جو کہ بیع شمار ہوتے ہیں تو ایسے موارد کو بیع سے نکالنا ہی تخصیص شمار کیا گیا ہے۔[2]

چنانچہ وہ افراد جنہوں نے مذکورہ آیت کو صریح شمار کیا ہے اور اسم جنس معرّف ال کو عمومی صیغہ شمار کیا ہے۔ ان کو چاہیے کہ وہ اسی حکم عام کو سُنت کے ذریعے سے مناسب بیان کریں یا پھر قرآن مجید سے تخصیص کے شواہد کو پیدا کریں یا ایسے شواہد کو لائیں جن کی وجہ سے مذکورہ عام بیان کے اجمال کو قبول کیا جائے اور سُنّت کے ذریعے تفصیل حکم کے راستے کو کھول دیا جائے۔[3]

بعض محققین نے آیت کے عام ہونے کو قبول نہیں کیا اور اس کے مجمل ہونے کا حکم لگایا ہے۔ یعنی اُنہوں نے تمام اقسام معاملات کے حکم شرعی کی تفصیل کے مقام بیان پر ہونے کو قبول نہیں کیا۔ چنانچہ اس قول کی تائید میں قرآن سے شواہد کو پیش کرنا ممکن ہے۔

۱) سیاق آیت

۲) ایسی آیات موجود ہیں جنہوں نے بعض معاملات کے فاسد و باطل ہونے کا اعلان کیا ہے۔ سیاق آیت تمام معاملات میں ظہور ہونے کی تردید کرتا ہے۔ کیونکہ اس کو اُن لوگوں کی بات کو آگے بڑھانا شمار کیا ہے جو سود کو حلال جانتے ہیں اور اس کے حرام ہونے کے ذریعے بیع کی حلیّت پر اعتراض کیا ہے۔[4]

الّذينَ يأْكلُونَ الرِّبا لا يقُومُونَ إِلاّ كما يقُومُ الّذى يتَخَبّطُهُ الشّيطانُ مِنَ الْمَسّ ذلِک بِأَنّهُمْ قالُوا إِنّمَا الْبَيعُ مِثْلُ الرِّبا وَ أَحَلّ اللّٰهُ الْبَيعَ وَ حَرّمَ الرِّبا.[5]

البتہ اس تفسیری نظریہ کو اکثر مفسرین نے قبول نہیں کیا ہے، اس کے علاوہ اس آیت اور دوسری آیات میں بھی قرائن موجود ہیں جو ہر معاملے کی حلیت پر حکم عام کی عمومیت کی تردید کر رہی ہیں۔ اس بنا پر

---

[1] ۔ بقرہ، ۲۷۵

[2] ۔ القرطبی، الجامع الاحکام القرآن، ج ۳ ص ۳۵۶

[3] ۔ السیوطی، الاتقان، ج ۲ ص ۲۰

[4] ۔ فخر رازی، تفسیر کبیر، ج ۳ ص ۷۷

[5] ۔ بقرہ، ۲۷۵

کہا جاسکتا ہے کہ آیت کا یہ حصہ عموم افراد کے مقام بیان پر نہیں ہے اور سودی معاملات کی حرمت ذیل آیت (حرم الربا) کے ذریعے ثابت ہے یا پھر باطل معاملات کی حرمت آیت یا أَیهَا الّذینَ آمَنُوا لا تَأْکلُوا أَمْوالَکمْ بَینَکمْ بِالْباطِلِ[1] میں بیان ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ آیات تمام فاسد معاملات کی تفصیل کو بیان نہیں کررہیں۔ لیکن اجمالی طور پر بعض معاملات کے غیر مشروع ہونے کو بیان کرتے ہوئے سنت کی طرف رجوع کرنے کے راستے کو کھول رہی ہیں۔ یہاں تک قرآن کے بیان ہونے کو صرف ایک زاویے سے یعنی بعض آیات جو "خاص"، "عام"، "محکم"، "متشابہ"، "مطلق" اور "مقید" ہونے کے لحاظ سے نازل ہوئی ہیں کے اعتبار سے زیر بحث لایا گیا ہے۔

بحث سوم: قرآن کریم کے کا انداز بیان

قرآن مجید بھی دوسرے کلاموں کی طرح بیان کے مختلف طریقے رکھتا ہے اور مشکل و پیچیدہ بیانات رکھتا ہے مگر بات یہ سمجھنی ہے کہ قرآن کریم کی یہ خصوصیت قرآن مجید کے "بیان" و "مبین" ہونے کے ساتھ کس طرح کی مناسبت رکھتی ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس پر زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے اور ہم نے ذیل میں ان کو ذکر کیا ہے تاکہ اس کے پہلو زیادہ آشکار ہو جائیں۔

۱) آسان و مشکل:

قرآن مجید معنی کو مخاطب تک پہنچانے میں اپنا ایک مخصوص طریقہ رکھتا ہے۔ اتنا سادہ اور عامہ گفتار کا طریقہ بھی نہیں ہے اور خواص کے جیسے تعبیرات کی پیچیدگی بھی نہیں ہے۔ بلکہ ان دو کے درمیان کا طریقہ (طریقہ سہل و ممتنع) ہے۔ تعبیر اور ادائے مطالب میں بے حد سہل ہے۔ چنانچہ ہر شخص (عالم و عام خرد) اس کو سمجھ لیتا ہے۔ کم علم ہو یا صاحب علم، ہر ایک اس کا مطلب پالیتا ہے اور مشکل بھی ہے۔ کیونکہ اس کی بنائیں بلند اور مقاصد عالی ہیں جو کہ ہر ایک کی دسترس میں نہیں ہیں اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اس کا ظاہر آراستہ اور باطن گہرا اور ظاہر و باطن کے کمال کو اپنے اندر جمع کیے ہوئے ہے۔ قرآن کی عبارات روشن ہیں جنہیں عام لوگ بھی سمجھ لیتے ہیں اور اپنے فہم و ادارک پر مکمل طور پر مطمئن ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ خاص افراد کے لیے اشارے موجو ہیں جو کہ دوسروں پر پوشیدہ ہیں۔ یہاں تک کہ مناسب مہارت علمی کے حامل افراد اس کی گرہوں کو کھول لیتے ہیں اور اس کی حقیقتوں سے پردہ اٹھا لیتے ہیں اور یہ اس وجہ سے ہے کہ قرآن کریم اپنے استعمالات میں یہ قوت رکھتا ہے کہ ظاہری معنی اور باطنی معنی کے درمیان جمع کرے۔

[1] ۔ نساء، ۲۹

تاکہ ہر لفظ سے دو یا کئی معانی کا افادہ کرے یا پھر وسیع معانی کو زمانے اور نسلوں کے تجدّد کے ساتھ بیان کرے۔ یہ نکتہ عرف عام کے مطابق مشکل پیدا کرتا ہے۔ علم اصول کے علماء کی اصطلاح میں لفظ واحد کے لیے کئی مستقل معانی کا ارادہ کرنا ممتنع ہے۔ مگر قرآن مجید نے اس امتناع کے خلاف آسانی کے ساتھ معانی و مفاہیم میں لفظ واحد کے استعمال کو اپنا طریقہ قرار دیا ہے۔[1]

۲) متعدد معانی کے درمیان جمع:

بعض متقدم اصولی علماء نے لفظ واحد سے کئی معانی کا مستقل طور پر ارادہ کرنے کو عقلاً ممتنع جانا ہے۔ کیونکہ استعمال کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ لفظ کو معنی کے لیے صرف علامت قرار دیا جائے بلکہ عنوان معنی ایک لحاظ سے تو خود معنی ہے۔ حتیٰ کہ معنی کا حُسن و قُبح بھی لفظ کی طرف سرایت کرتا ہے۔ بنابرایں ممکن نہیں ہے کہ ان حالات میں لفظ واحد ایک معنی سے زیادہ معانی میں استعمال ہو۔

مگر متأخر اصولی علماء نے کوشش کی ہے کہ اس امتناع عقلی کو جائز قرار دیں۔ بلکہ اس کو عام متعارف استعمال سے خارج ہی سمجھیں۔ لہٰذا ان کے نظریہ کے مطابق لفظ کے استعمال سے معنیٰ کا ارادہ کرنا نصب علامت سے شمار ہوتا ہے۔ جس طرح خطرہ کی علامتوں کو نصب کیا جاتا ہے لہٰذا جب لفظ ذاتی طور پر صلاحیت رکھتا ہے تو عقلی طور پر بھی کوئی ممانعت نہیں ہے کہ ایک علامت دو یا کئی معانی کے لیے قرار نہ دی جائے اور استعمال کے وقت دونوں معنیٰ مقصود ہوں۔ البتہ ایسا استعمال مشہور و متعارف نہیں ہے۔

مگر قرآن کریم نے اس مشکل کو آسان شمار کرکے بہت سارے موارد میں اس کو استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ایک لفظ کا استعمال اس کی دلالت اولی کی بناپر جبکہ اس کے ظاہری معنیٰ کا ارادہ کیا ہے مگر اُسی استعمال کے وقت عام کے دوسرے معانی کو بھی لحاظ کیا ہے جس میں دوسرے موارد بھی شامل ہیں کو اس طرح کہ عام کے اسی معنی دوئم کو مقام بیان میں افادہ کرتا ہے جو کہ قرآن کریم کا اصل مقصود ہے اور قرآن مجید کے مقاصد کی بقاء اور استمرار کو ہر زمانے میں عمومی طور پر ضامن ہوتا ہے اور اس کو موارد مخصوص (نزول کے مورد) میں منحصر ہونے سے خارج کر دیتا ہے۔ کیونکہ خداوند متعال تمام چیزوں پر احاطہ کامل رکھتا ہے اور اس کی عطا و عنایت تمام بندوں کو شامل ہوتی ہے اور اس بات میں شک نہیں ہے کہ آیت کا معنیٰ عام اپنی ذات کی حد تک دوسرا معنی ہے جو کہ لفظ سے مستقل طور پر ارادہ کیا جاتا ہے اور لفظ کے پہلے اور ظاہری معنی سے جدا ہوتا ہے۔

---

[1] ۔ تفسیر و مفسران، ھادی معرفت، ج ۱ ص ۹۸

بنابرایں معنی ظاہری و باطنی دونوں مستقل طور پر مقصود لفظ ہیں اور کوئی بھی دوسرے کے نیچے درج نہیں ہوتا ہے۔[1]

بہر حال مفہوم اوّل جو کہ آیت کے شان نزول کی خصوصیات کے مطابق ذہن میں آتا ہے اس کا ظاہری معنٰی ہے جس کو تنزیل کہتے ہیں۔ مگر عام مفہوم جو اس آیت سے لیا جاتا ہے جو تمام مشابہ موارد پر منطبق ہونے کی قابلیت رکھتا ہے اس کو باطنی معنٰی اور دوسری تعبیر کے مطابق تاویل آیت ہے اور آیت کا یہی دوسرا عام معنٰی ہی سارے زمانے میں اس کی بقاء کا ضامن ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس حدیث متواتر کے بارے میں پوچھا گیا جس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ما من آیة و لها ظهرٌ و بطن... حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: ظاہر سے مراد تنزیل اور باطن سے مراد تاویل ہے۔ کچھ مصادیق اس کے گزر چکے ہیں اور کچھ مصادیق آنے والے ہیں۔ جیسے آنا، جانا اور سورج چاند کی گردش وغیرہ۔ جب بھی ان مصادیق سے کسی مصداق کے ظاہر ہونے کا وقت آتا ہے وہ واقع ہو جاتا ہے۔۔۔ نیز امام علیہ السلام نے فرمایا: اگر کوئی آیت کسی گروہ کے بارے میں نازل ہو جب وہ قوم مرتی ہے تو وہ آیت بھی مر جائے تو قرآن مجید سے کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ حالانکہ ابتداء سے انتہا تک جب تک آسمان و زمین باقی ہیں، قرآن مجید اسی طرح تر و تازہ رہے گا اور جو گروہ آیت کی تلاوت کرتا ہے اپنے آپ کو اس کا مصداق پاتا ہے۔ وہ آیت خیر کی ہو یا شر کو بیان کرنے والی ہو۔[2]

قرآن کریم کے باطن کا علم اور تمام مشابہ موارد پر قابل انطباق مفہوم عام کے سمجھنے پر قدرت "راسخون فی العلم" سے مخصوص ہے اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں کہ آیت کی ظاہری دلالت سے اس کو سمجھ لے۔ چنانچہ قرآن مجید کی دلالت دو طرح کی ہوتی ہے۔

۱) وہ دلالت جو آیت کی ظاہری تعبیر سے سمجھ میں آتی ہے۔

۲) وہ دلالت جو کہ تاویل کا وسیلہ ہیں اور محتوائے آیت کے باطن سے سمجھ میں آتا ہے اس طرح کہ مفہوم عام اور سارے زمانے میں مشابہ موارد پر منطبق ہونے والی تاویل آیت کے اندر سے سمجھا جا سکے۔ پس قرآن کریم ظاہری و باطنی دلالت رکھتا ہے۔ لہٰذا اسی دلیل کی بنا پر قرآن مجید کیفیت دلالت کے لحاظ سے باقی تمام کلاموں پر ممتاز ہے۔ مثلاً: انفاق کی آیات اسلام کی عزّت کے دفاع میں نازل ہوئی ہیں۔ لہذا اس واجب دینی کا انجام دینا تمام مسلمانوں پر ضروری ہوا۔ اس لیے ان کو چاہیے کہ اپنے آپ کو آمادہ کریں اور اس

[1] ۔ تفسیر و مفسران، سید ھادی معرفت، ج ۱ ص ۹۹
[2] ۔ تفسیر عیاشی، ج ۱ ص ۱۰ شمارہ حدیث ۷

کے انجام دینے کے اسباب کو فراہم کریں۔ ان اسباب میں سے جان کے قربان کرنے کے علاوہ مال کا قربان کرنا بھی تھا۔ یہ ایسا حکم ہے جو تمام مکلفین پر واجب ہے اور ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اس پر عمل کرے۔ چنانچہ ظاہر آیت سے بھی یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ البتہ فقیہ دانا وسیع تر مدلولات اور معانی کو کشف کرتا ہے جو کہ اسلامی عادلانہ حکومت کے تمام ضروریات کو پورا کرتے ہیں جو کہ کلمۃ اللہ فی الارض کے زندہ رکھنے کے لیے بنائی جاتی ہے لہٰذا فرض ہے اسلامی عادلانہ حکومت کی بنیادوں کو محکم و مستحکم کرنے کے لیے مال کو خرچ کرنے سے دریغ نہ کریں اور حاکم کے مقرر کردہ نظام کے مطابق مالیات کی ادائیگی کریں اور یہ مطلب باطن محتوائے آیت اور اصطلاحی طور پر تاویل آیت سے ثابت ہوتا ہے اور آیت خمس سے غنیمتیں، خمس کا واجب ہونا، تمام تر فوائد اور تجارتی منفعت کا خمس سمجھ میں آتا ہے۔ چنانچہ حضرت امام صادق علیہ السلام نے آیت میں سے ''ما'' موصولہ میں عمومی دلالت اور لفظ غنیمت کے اطلاق سے جو کہ مطلق فائدہ پر اطلاق کرتا ہے استدلال کیا ہے۔ اس طرح کے نمونے قرآن مجید میں بہت زیادہ ہیں جو کہ قرآن کریم کے معجزہ خالدہ ہونے کا سبب ہیں۔

۳) قرآن کریم کی مخصوص زبان:

قرآن مجید اپنی ایک خاص زبان رکھتا ہے۔ کلمات اور تعبیرات کو ایسے معانی میں استعمال کرتا ہے جن کا وہ خود ارادہ رکھتا ہے۔ اگرچہ کسی دوسری زبان یا کسی دوسرے عُرف عام میں اس استعمال کی کوئی دلیل موجود نہ بھی ہو۔ کیونکہ اس طرح کے استعمال صرف قرآن مجید کی مخصوص اصطلاحات ہیں۔ جن کو صرف قرآن کریم سے سمجھا جاسکتا ہے۔ حضرت امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام اس دلیل کے بارے میں فرماتے ہیں کہ بعض آیات، قرآن کریم کی دوسری آیات سے سمجھی جاتی ہیں اور اس کی آیات دوسری آیات پر گواہ ہیں۔[1]

اسی طرح قرآن کریم میں ایسی تعبیرات موجود ہیں جن کے دقیق معانی کو سمجھنے کے لیے علم کامل اور گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے اور سوائے باریک فکری اور بعض آیات کو دوسری بعض آیات کے ساتھ ملانے کے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اس دلیل کی بنا پر علامہ طباطبائی فرماتے ہیں کہ مفاہیم قرآن مجید کی دلالت خود قرآن کریم سے میسر ہوتی ہے اور ہر گز نہیں ہو سکتا کہ قرآن کریم کے باہر سے قرآن کے اندر کو سمجھا جائے۔ کیونکہ جب قرآن ''تبیان لکل شئی'' ہے تو کبھی نہیں ہو سکتا کہ اپنے آپ کو بیان نہ کرے۔ بلکہ بعض آیات بعض، دوسری آیات کی تفسیر کرتی ہیں اور یہ مسئلہ تفسیر میں معتبر اور قابل اعتماد

[1] ۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۳۳

اصولوں میں شمار ہوتا ہے اور علامہ طباطبائی نے اپنی تفسیر المیزان میں اسی طریقہ تفسیر کو اپنایا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ "اذن" قرآن مجید میں مشیت الٰہی اور اس کے خاص ارادے کے مطابق دائمی تاثیر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی خداوند متعال کی طرف سے فیض مستمر اور دائم اس طرح ہے کہ عالم تکوینی میں اثر انداز ہونا اذن خدا پر موقوف ہے۔ یعنی خداوند متعال ہر عمل کرنے والے کی قوت میں تاثیری خصوصیت کو اس حالت میں اس کو عطا کرتا ہے اور اس کو استمرار و دوام بخشتا ہے اور اپنی عنایت کو کبھی منقطع نہیں کرتا ہے۔ ورنہ عمل کرنے والے کی قوت تاثیر سے خالی ہو جائے گی۔

وَ ما تَشاؤُنَ إِلاّ ان یشاءَ اللہُ رَبّ الْعالَمینَ [1]

یہ ارادہ، ایسا ارادہ ہے جو کہ عالم طبیعت میں اثر انداز ہونے کے امکان کو چیزوں میں پیدا کرتا ہے۔ "لا مؤثر فی الموجد الا اللہ" قرآن کریم کی اصطلاح میں یہ وہی عالم تکوینی میں "اذن" کا معنی ہے جو کہ مذکورہ بالا آیت سے مستفاد ہوتا ہے۔ ما تَشاؤُنَ إِلاّ ان یشاءَ اللہُ [2]

قرآن کریم میں لفظ قلب کا معنی انسان کی باطنی شخصیت (حقیقی) کا ہے جو کہ اس ظاہری شخصیت کے اندر پنہاں اور انسان کے قیمتی ادراکات اور بلند احساسات کا مرکز ہے۔

اِنّ فی ذلِک لَذِکری لِمَنْ کانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَی السّمْعَ وَ هُوَ شَهیدٌ [3] یا أَیهَا الّذینَ آمَنُوا اسْتَجیبُوا لِلہِ وَ لِلرّسُولِ إِذا دَعاکمْ لِما یحْییکمْ وَ اعْلَمُوا ان اللہَ یحُولُ بَینَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهِ وَ أَنّهُ إِلَیهِ تُحْشَرُونَ. [4]

اس آیت مبارکہ میں "قلب" سے مراد انسان کی بلند یہ شخصیت ہے کہ جب بھی شرعی قوانین پر عمل کرنے سے سرتابی کرتا ہے تو حیوان شمار ہوتا ہے تو پھر اُس میں انسانیت نامی کوئی چیز باقی نہیں رہتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ صدور احکام کے لیے قرائن حالیہ پر اعتماد کرتا ہے جو کہ خارجی واقعات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جو کہ حال خطاب میں موجود قرینہ کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں نہ یہ کہ حقیقی قضایا ہوں جو ہر زمانے اور ہر جگہ موضوعات احکام پر جاری ہوں۔ یہ صورت جو کہ قرآن کریم میں بہت زیادہ مؤثر ہے اور کبھی ممکن ہے کہ کوئی ان قضایا کو حقیقی شمار کرے جبکہ ایسا نہیں ہے۔

---

[1] ۔ تکویر، ۲۹

[2] ۔ انسان، ۳۰

[3] ۔ ق، ۳۷

[4] ۔ انفال، ۲۴

لَتَجِدَنّ أَشَدّ النّاسِ عَداوَةً لِلّذينَ آمَنُوا الْيهُودَ وَ الّذينَ أَشْرَكوا وَ لَتَجِدَنّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدّةً لِلّذينَ آمَنُوا الّذينَ قالُوا إِنّا نَصارى ذلِک بِأَنّ مِنْهُمْ قِسّيسينَ وَ رُهْباناً وَ أَنّهُمْ لا يسْتَكبِرُونَ [1]

اس آیت مبارکہ میں مراد مطلق طور پر یہودی مشرکین اور نصاریٰ نہیں ہیں بلکہ یہودی ہونے سے مراد ایک ایسا گروہ ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم عصر تھے اور مشرکین سے مراد قریش مشرکین تھے اور نصاریٰ سے مراد زمانے کے نصاریٰ نجران ہیں اور ایک قول کی بنا پر نجاشی کا بھیجا ہوا وفد ہے۔

۴) ایجاز وایفاء کے درمیان جمع بندی:

قرآن کریم کی ایک اور خصوصیت مختصر ترین اور سادہ ترین تعبیرات کے ذریعے بہت سارے مطالب کو بیان کرنا ہے۔ مثال کے طور پر قاعدہ لطف ہے جو کہ تمام آسمانی شریعتوں کی بنیاد ہے۔

وَ لكنّ اللهَ حَبّبَ إِلَيكمُ الْإيمانَ وَ زَينَهُ فى قُلُوبِكمْ وَ كرّهَ إِلَيكمُ الْكفْرَ وَ الْفُسُوقَ وَ الْعِصْيانَ [2]

اس آیت کا مقصد، خداوند متعال کی طرف سے بندوں پر لطف و عنایت ہے جن کے لیے اسباب اطاعت فراہم کر کے اُن کے حوالے کیے ہیں تاکہ بندے خدا کی اطاعت کر سکیں اور گناہوں کی نجاست سے دور رہیں۔ اس طرح کہ خدا پر ایمان اور اطاعت و پیروی کو ان کے دلوں میں آراستہ کرتا ہے اور آراستگی کو اُن پر ظاہر کرتا ہے چنانچہ گناہوں کی ناپسندگی کو اُن پر عیاں کر دیتا ہے تو وہ خود ان سے دور ہو جاتے ہیں۔ بنا بر ایں ایک مومن اس حال میں خدا کی اطاعت کرتا ہے جب خود خدا اطاعت کو اُس کے دل میں ڈال دیتا ہے اور وہ اُس سے محبت کرتا ہے لہٰذا بے حد اطمینان و سکون کے ساتھ خدا کی اطاعت و بندگی کو انجام دیتا ہے۔ پس اسی طرح گناہوں کو بھی مکمل آسانی کے ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ کیونکہ اندر سے گناہوں سے نفرت کرتا ہے۔ چنانچہ یہ قاعدہ لطف ہے جو کہ آیت مبارکہ سے مستفاد ہوتا ہے۔ قاعدہ لطف یعنی بندوں کو اطاعت کے قریب کرنے کے اسباب اور گناہوں سے دوری کے موجبات کو مہیا کرنا ہے۔

---

[1] ۔ مائدہ/۸۲

[2] ۔ حجرات، ۷

۵) قناعت خاص کی صورت میں فہم عام کی رعایت :

قرآن کریم نے اپنے تعلیمات اور پیغامات کے پہنچانے میں ایسے طریقہ کو اپنایا ہے کہ جس کے ذریعے سے عام لوگ بھی اُس سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور صاحبان علم بھی اس کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ایسی تعبیرات استعمال ہوئی ہیں جن کو دونوں گروہ سمجھتے ہیں۔ عام لوگ اُس کے ظاہر کلام سے بہرہ مند ہوتے ہوئے ظاہری معنی کو حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ذہن ان حسی معاملات سے مانوس ہیں اور اہل علم اُس حقیقت کو چاہتے ہیں جو ان تعبیرات میں پنہاں ہوتی ہے اور اس کے لطیف اشاروں اور ظریف کنایوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ان کے سامنے سر تسلیم و خضوع جھکا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیت اللّٰهُ نُورُ السّماواتِ وَ ٱلأَرْضِ...[1] کو دیکھا جاسکتا ہے۔ جس میں خداوند متعال نے اپنی ذات اقدس کو عالم ہستی پر پیش کیا ہے۔ چونکہ عالم حسی میں بلند ترین مرتبہ نور کا ہے لہٰذا خدا نے اس سے مثال دی ہے کیونکہ عام لوگ اس نور کی تصویر کو سمجھ سکتے ہیں کہ خداوند کریم کی ذات اقدس ایسی شفاف اور نمایاں ذات ہے جو کہ ماورائے عالم حسی کے ہے اور عالم حسی میں نور کے ساتھ شباہت رکھتا ہے اور اس طرح کے تصور پر قناعت کر لیتے ہیں۔

مگر اہل علم اس تشبیہ سے ذات اقدس حق کا قریبی ترین تصور کو رکھتے ہیں کہ عالم حسی میں نور سے بہتر کوئی چیز نہیں جو خداوند کریم کی مثال بن سکے اور خدا کے مخصوص اوصاف کی راہنمائی کر سکے۔ کیونکہ نور بذات خود ظاہر و آشکار ہے اور اپنے علاوہ سب کو ظاہر کرنے والا ہے۔

عالم حسی میں تمام چیزوں کا ظہور نور کے ساتھ ہے اور نور خود ظاہر ہے کسی دوسرے کی وجہ سے اس کا ظہور نہیں ہے۔ عالم محسوسات میں نور سے بڑھ کر ظاہر تر کوئی چیز نہیں ہے جبکہ بے حد پوشیدہ اور مخفی بھی ہے جس کے ظاہری اثرات دکھائی دے رہے ہیں مگر حقیقت میں اس کی ذات مخفی اور پوشیدہ ہے اور خدا کے صفات بھی اسی معنی میں ہیں۔ پس اگر حقیقت وجودی خدا کو نگاہ میں رکھیں تو قائم بالذات ہے اور غیر خود کا مظہر ہے اس کی ذات مخفی اور اس کے وجود کے آثار ظاہر ہیں۔[2]

اسی طرح ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ قرآن اپنے استدلالات میں دو طریقوں کے درمیانی روش کو اپنایا ہے جو کہ ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اس کی ایک روش استدلالی خطابی اور دوسری بُرھانی ہے پہلی روش عام لوگوں کو قانع کرنے والی ہے جو مظنونات و مقبولات قضایا پر استوار ہے اور دوسری روش کا تعلق اہل علم کے

---

[1] ۔ نور، ۳۵

[2] ۔ تفسیر و مفسران، محمد ھادی معرفت، ج۱، ص۱۰۹

ساتھ ہے جو اولیات و یقینیات قضایا پر مشتمل ہے۔ اس صورت حال میں ہر متکلم کے لیے محال ہے کہ دونوں گروہوں کے مقصد کو ان کی روش کے مطابق حاصل کرے کیونکہ مظنونہ اور متیقنہ قضایا کو ایک کلام میں جمع کرنا ممکن نہیں ہے مگر قرآن کریم نے اپنے عجیب بیان اور حیرت انگیز طریقہ سے اس اہم کام کو کیا ہے۔

۶) استعارہ، مجاز اور کنایہ کا استعمال:

قرآن کریم نے بہت اچھے طریقے سے بلاغتی فنون کی اقسام سے استفادہ اور استعارات، کنایات اور مجازات سے تعبیرات لفظیہ کو استعمال کیا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید نے وسیع آفاقی معانی کو پیش کیا ہے قرآن کریم اگرچہ عربوں کی زبان کے الفاظ و کلمات میں اتارا گیا ہے لیکن عربوں کے مورد استعمال الفاظ کو بہت کم استعمال کیا ہے کیونکہ عربوں نے الفاظ کو اپنے احتیاجات کے مطابق نچلی سطح پر استعمال کیا ہے جو قرآن مجید کے وسیع اور بلند معانی کی گنجائش نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا قرآن کریم نے استعارہ، کنایہ اور مجاز کو لایا ہے جن کا دامن بے حد وسیع ہے اس وجہ سے اُس وقت کے عربوں کے سامنے ایسے بلند و بالا معانی تازگی رکھتے تھے بعض اوقات بعض تعبیرات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ قرآن کریم گفتگو کرنے میں خالق کلام ہونے اور کلامی فنون کی اقسام سے استفادہ کرنے میں اور الفاظ کے معانی و مفاہیم پر احاطہ کرنے والی قدرت نیز اپنے بیانات میں بدیع طور پر نکتہ سنجی میں اپنے طریقہ بیان کو ان کے سامنے پیش کیا جو کہ مکمل طور پر نیا طریقہ تھا اور بے مثل و بے مثال تھا۔ لہٰذا متکلمین اور فصحاء عرب کو اپنے اوپر فریفتہ کر لیا اور انہوں نے قرآن کریم کے سامنے زانو ادب بچھا دیے۔ لہٰذا یہ موضوع اعجاز قرآن کریم کے مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے سبب بن گیا۔

نتیجہ بحث:

قرآن کریم "مبین"، "بیان"، "مبینات"، "بینات"، "بینہ"، "بیان کل شئ"، "نور"، "برھان" اور "ھُدیٰ" جیسی صفات کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے اور اپنے مقاصد و اہداف میں بیان قرآن کریم واضح ہے۔

مگر کیا مذکورہ بالا اوصاف قرآن مجید کے بعض کلمات جیسے آیات کا "متشابہ"، "مجمل"، "مخصص"، "مقید"، "عام" اور وہ آیات جن کا سمجھنا اسباب نزول آیات کا محتاج ہے کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے مگر جواب میں فہم قرآن کریم کے مختلف طریقے جو قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں کو سامنے رکھنا اشد ضروری ہے۔ ایک گروہ نے فہم قرآن کریم کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، صحابہ اور صدر اسلام کے مسلمانوں سے نقل روایات کے ساتھ مربوط جانا ہے اور ہم (مصنف) نے اس کو نقل گرائی افراطی کا نام دیا ہے۔ اس طریقہ فہم قرآن کریم کے حامیوں کو اخباری کہا گیا ہے اور قرآن

مجید کے بیان ہونے کو ایک خاص گروہ (عرف ائمہ ھُدیٰ) پر اطلاق کرتے ہیں اور دوسرا طریقہ فہم قرآن مجید کا وہ ہے کہ جس میں قرآن کریم کے بیان ہونے پر اصلاً توجہ ہی نہیں کی۔ اس سے متعلق تاویلی اور باطنی واقعات تاریخ اسلام میں موجود ہیں۔ اگرچہ تاویل و باطن قرآن، اصل قرآن کریم کی تعلیمات کی گہرائی کا پہلو اور قرآن مجید کے پیغامات کے باطن کا جاوید ہونا ایک ثابت بات ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ بعض فرقے حقیقت باطنی کو نفی ظاہر کے معنی میں لیتے ہیں اور احکام شرعی کو کنارے لگانا شمار کرتے ہیں اور منحرف ہوئے ہیں۔ بعض گروہوں نے قرآن مجید کے بیان ہونے کو ظاہر پرستی کا نام دیا ہے اور قرآن کریم کے باطنی پہلوؤں اور بلند معانی قرآن پر توجہ نہیں دی۔ چنانچہ تعلیمات دینی اور تاویل متشابہات کے درمیان جمع کرنے کو ناروا سمجھا ہے۔ جبکہ قرآن مجید کے "بیان "و"مبین" ہونے کے مسئلہ کو قرآن کریم و دینی معرفت کا نام دیا ہے جن کا دوسری دینی تعلیمات کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ضروری ہے اور ان میں سے ہر ایک پر توجہ نہ دینا تحلیل مذکور میں خامی کی دلیل ہے۔ البتہ قرآن کریم کے بیان ہونے کو گوناگوں معانی پر محمول کرنا ممکن ہے جیسے:

پہلا معنی کہ قرآن کریم مبہم و پنہاں ہونے کے مقابلے میں بیان ہے۔ یعنی اس کی دلالت کچھ معانی پر متردد ہو اور ان معانی میں سے کسی ایک معنی کو دوسرے معانی پر ترجیح حاصل نہ ہو۔

دوسرا معنی کہ قرآن کریم بیان ہے یعنی اس کے معنی بدیہی تدبر واضح ہیں مبہم و پنہاں نہیں ہیں۔

تیسرا معنی یہ ہے کہ قرآن کریم بیان ہے یعنی اس کے معنی میں تفصیل ہے اور تمام جزئیات و تفصیلات اجمال و کلی کے مقابلے میں پائے جاتے ہیں۔

بحث و تمحیص کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم "بیان "و"مبین" ہے۔ البتہ اس معنی میں نہیں ہے کہ تمام تفصیلات فروعات اور جزئی مطالب رکھتا ہو۔ اس طرح کہ بدیہی اور ہر پیچیدگی سے دور ہو اور اس معنٰی میں کہ قرآن کریم کا ابہام اور پیچیدگی حل نہ ہونے والی نہ ہو۔ بلکہ ہر ابہام اور باریکی حل ہونے والی ہے اور اپنے مقاصد کو ٹھیک طور پر پہنچانے والا ہے۔ چنانچہ ادبی ابہام، عربی کے قواعد و ضوابط سے آگاہی کے ذریعے حل ہونے والا ہے اور معانی کی پیچیدگیاں اور تفسیری مشکلات کو قرآن کریم کے قرائن و شواہد اور زبان قرآن کریم کو سمجھنے کے ذریعے سے قابل فہم و درک ہیں۔

آیات کے عملی اثرات مختلف ہیں کبھی تو آیت کی تفسیر و تفصیل کو شان نزول کے ذریعے حل کیا گیا ہے۔ کبھی مجمل آیت، کبھی عام، کبھی محکم، کبھی متشابہ، نسخ، تخصیص، تقیید ہونا قرآن کریم کے بیان ہونے کو کوئی نقصان نہیں دیتا بلکہ آیات کو درست طور پر درک کرنے میں مدد دیتا ہے۔

قرآن مجید دوسرے کلاموں کی طرح اپنے مخصوص طریقے رکھتا ہے۔

(طریقہ آسان و مشکل) جو کہ تعبیرات اور معانی کی ادائیگی میں سہل و آسان ہے، اس طرح کہ ہر کوئی اس کو سمجھ لیتا ہے اور ساتھ ایسے اشارے موجود ہیں جو خاص افراد کے لیے ہیں اور دوسروں پر پوشیدہ ہیں جب تک علمی مہارت کا حصول نہ ہو گا تب تک اس کی گرہیں کھل نہیں سکتیں۔ (متعدد معانی کے درمیان جمع) جس میں ایک لفظ کے استعمال میں دلالت اوّلی سے اس کے ظاہری معنی کا ارادہ کیا گیا ہے جبکہ اس کے ساتھ عام مفہوم جو دوسرے موارد کو بھی شامل ہوتا ہے لحاظ کیا گیا ہے۔ اس طریقہ پر کہ یہ دوسرا عام مفہوم قرآن کریم کے مقاصد میں استمرار و دوام کا ضامن ہے جو کہ طول زمان کو عام اور شامل ہوتا ہے اور اس کو موارد خاص (مورد نزول) سے خارج کر دیتا ہے۔ (قرآن کریم کی اپنی مخصوص زبان) قرآن مجید الفاظ اور تعبیرات کو ایسے معانی میں استعمال کرتا ہے جس پر لغت یا دوسرے عُرف میں کوئی دلیل موجود نہ بھی ہو۔ (ایجاز و ایفاء کے درمیان جمع کیا ہے) یعنی وسیع اور فراواں مطالب کو مختصر ترین تعبیرات اور سادہ ترین کلمات کے ذریعے پہنچاتا ہے۔

(قناعت خاص میں فہم عام کی رعایت) یعنی اس سے عام لوگ بھی بہرہ مند ہوں اور اہل علم بھی اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔

(استعارہ، مجاز کنایہ کا استعمال) قرآن مجید میں استعارہ، کنایہ اور مجاز کو رکھا گیا ہے۔ پھر بھی قرآن کریم کے بیان ہونے میں کوئی مشکل نہیں آتی۔

فہرست منابع

۱. قرآن کریم.

۲. نهج البلاغه.

۳. ابن ماجه، سنن، بی‌جا، بی‌تا، بی‌نا.

۴. ابن منظور، لسان العرب. بی‌جا، بی‌تا، بی‌نا.

۵. استرآبادی، مُحَمَّد امین، الفوائد المدنیه، بی جا، دار النشر لاهل البیت، بی تا.

۶. اسعدی، مُحَمَّد، لایه‌ها و سایه‌های معنایی، قم، مرکز چاپ و نشر دفتر تبلیغات اسلامی، ۱۳۸۵ ش.

۷. اصفهانی، راغب، مقدمه جامع التفاسیر، بی‌جا، بی نا، بی‌تا.

۸. حنبل احمد، سنن. بی‌جا، بی‌تا، بی‌نا.

۹. خمینی روح الله، آداب الصلواة، بی نا، مؤسسه تنظیم و نشر و آثار امام خمینی، ۱۳۷۲.

۱۰. خمینی، روح الله تفسیر سوره حمد، بی جا، مؤسسه تنظیم نشر و آثار امام خمینی، ۱۳۷۵ش.
۱۱. خمینی، روح الله، تهذیب الاصول، بقلم جعفر سبحانی، قم، جامة المدرسین، بی‌تا.
۱۲. خمینی، روح الله، صحیفه نور، بی جا، وزارت فرهنگ و ارشاد اسلامی، ۱۳۷۵.
۱۳. خمینی، روح الله، کشف الاسرار، بی جا، بی‌نا، بی‌تا.
۱۴. خویی، سید ابوالقاسم، معجم رجال الحدیث، قم، منشورات مدینة العلم، بی‌تا.
۱۵. ذهبی، محمّد حسین، تفسیر و مفسران، مصر، دار الکتب الحدیثه، ۱۳۹۶ق.
۱۶. راوندی، قصص الانبیاء، مشهد، آستان قدس رضوی، ۱۳۶۸ش.
۱۷. ری شهری، محمّد نیک، میزان الحکمة. بی‌جا، بی‌تا، بی‌نا.
۱۸. زرقانی، مناهل العرفان فی علوم القرآن، بی جا، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۶ق.
۱۹. زرکشی، البرهان فی علوم القرآن، بیروت، دار المعرفة، بی تا.
۲۰. السیوطی، جلال الدین، الاتقان، بیروت، المکتبة الثقافیه، ۱۹۷۳م.
۲۱. الشاطبی، الموافقات، بیروت، دار المعرفه بی تا.
۲۲. شبرّ، مصابیح الانوار، بی‌جا، بی‌نا، ۱۳۷۱ق.
۲۳. صبحی صالح، مباحث فی علوم القرآن، بیروت، دار العلم للملایین، ۱۹۸۵م.
۲۴. طباطبایی محمّد حسین، المیزان، قم، دفتر انتشارات اسلامی، ۱۳۷۴ش.
۲۵. طباطبایی، محمّد حسین، قرآن در اسلام، قم، انتشارات هجرت، ۱۳۶۰ش.
۲۶. طبرسی، فضل بن حسن، مجمع البیان، بیروت، دار المعرفه، ۱۴۱۸ق.
۲۷. عیاشی، تفسیر عیاشی، بی‌جا، العلمیه الاسلامیه، ۱۳۶۳.
۲۸. فخر رازی، تفسیر کبیر، بیروت، دار احیاء التراث العربی، بی‌تا.
۲۹. قرطبی، الجامع الاحکام القرآن، بیروت، دار احیاء التراث العربی، بی‌تا.
۳۰. کلینی، محمّد یعقوب، الکافی، مترجم: محمّدباقر کمره ای، قم، انتشارات اسوه، ۱۳۷۹ش.
۳۱. کلینی، محمّد یعقوب، روضة الکافی، بی‌جا، دار الکتب الاسلامیه، ۱۳۴۸.
۳۲. مجلسی، محمّد باقر، بحارالانوار، بیروت، مؤسسه الوفاء، بی‌تا، چاپ دوم
۳۳. مجلسی، محمّد باقر، مرءاة العقول فی شرح اخبار آل الرسول، بی جا، دار الکتب الاسلامیه، ۱۳۶۳.
۳۴. معرفت، محمّد هادی، تفسیر و مفسران، بی جا، موسسه فرهنگی التمهید، ۱۳۷۹ق.
هادی مهدوی، مبانی کلامی اجتهاد در برداشت از قرآن، بی جا، موسسه فرهنگی خانه خرد، ۱۳۷۷.